ارمان شمسی اوران کی افسانہ نگاری

پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی*

[بنگلہ دیش کے اردو افسانے نگار غلام محمد، شام بار کپوری، شہزاد منظر، ایوب جوہر، احمد سعدی، راحت آرا بیگم وغیرہ کے بعد اردو افسانہ کو آگے بڑھانے والے اور بنگلہ دیش کا نام اردو دنیا میں روشن کرنے والے افسانہ نگار ارمان شمسی ہیں۔ان کے کل دس افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔''آشنائی کا کرب''(۲۰۰۳)،''ڈھلان سے ابھرتا سورج''(۲۰۰٦)،''خواب ریزے''(۲۰۰۹)،''پیاسی ندیا''(۲۰۰۹)، ''شناخت''(۲۰۱۱)،''کالی پری''(۲۰۱۳)،''ریشم کا جال''(۲۰۱۴)،''پرچھائیاں'' (۲۰۱۷)،''چاندنگر''(۲۰۱۷)، ''پرائی آنکھیں''(۲۰۲۰) منظر عام پرآئے ہیں۔ ارمان شمسی تقریباً ۱٦۰ افسانے لکھ چکے ہیں۔ ہندوستان کے مختلف جرائد''آجکل (دہلی)،''انتساب''(بھوپال)،''شاعر''(ممبئی)،''رنگ''(دھنباد)،''بیسویں صدی''(دہلی)،''شمع''(دہلی)،''آنندڈائجسٹ''(پٹنہ) میں چھپتے رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کا کردار حقیقی ہوتا ہے۔ دلکش انداز سے روزمرہ پیش آنے والا واقعات کو بڑی آسانی سے افسانہ کی شکل دے دیتے ہیں۔ارمان شمسی عموماً مزدور، غریبی، مفلسی، سرمایہ دارانہ طبقے کی جنس پرستی، اکثریتی فرقے کے مظالم، حکومتی ادارو ں کی عیاری، انسانی نفسیات، طبقاتی نابرابری جیسے موضوعات پر لکھتے ہیں۔]

بنگلہ دیش میں افسانہ نگاری کے میدان میں اس وقت صرف پانچ چھ افسانہ نگار باحیات ہیں۔ارمان شمسی، س م ساجد، ڈاکٹر لطیف احمد، اے نعیم اور قاسم انیس کے قلم اس وقت اردو افسانہ نگاری میں رواں ہیں۔

شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

قاسم انیس کے 'کرب وجود'، 'بہتے الاؤ' اور ایم نعیم کے 'محافظ'، 'پس پردہ' وغیرہ قابل ذکر افسانے ہیں۔ راجشاہی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر لطیف احمد کے کل چوبیس افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا ''شام ڈھلے'' افسانوی مجموعہ ۲۰۱۹ میں شائع ہو چکا ہے۔اس میں بارہ افسانے ہیں اور دوسرا افسانوی مجموعہ بھی شائع ہونے والا ہے۔ ان میں 'مہوئے کے پھول'، 'کالی تتلی'، 'کل چمن تھا آج صحرا ہوا'، 'وہ کون تھی'، 'سرحد'، 'خیر سے بدھو گھر واپس آئے'، 'مولسری تلے' 'دل نے تجھے پھر یاد کیا'، 'شیشہ کی دیوار' قابل ذکر افسانے ہیں۔[۱] س م ساجد افسانہ نگاری میں ایک وقفہ کے بعد پھر منظر میں آگئے ہیں۔ ۲۰۱۷ء میں ان کا ''ایک سوال انگن انگن'' افسانوی مجموعہ شائع ہوا ہے۔اس کے پہلے ۱۹۸۳ء میں احمد سعدی کے ساتھ ''دود چراغ محفل'' شائع ہوا تھا۔[۲] 'معمولی سی بات'، 'اوور ٹائم'، 'پاگل'، 'کتے'، 'کہانی کا قتل' اور 'ایک سوال انگن انگن' ان کے قابل ذکر افسانے ہیں۔[۳]

بنگلہ دیش کے اردو افسانے نگار غلام محمد، شام بارکپوری، شہزاد منظر، ایوب جوہر، احمد سعدی، راحت آرا بیگم وغیرہ کے بعد اردو افسانہ کو آگے بڑھانے والے اور بنگلہ دیش کا نام اردو دنیا میں روشن کرنے والے افسانہ نگار ارمان شمسی ہیں۔ان کے کل دس افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔''آشنائی کا کرب'' (۲۰۰۳)، ''ڈھلان سے ابھرتا سورج'' (۲۰۰۶)، ''خواب ریزے'' (۲۰۰۹)، ''پیاسی ندیا'' (۲۰۰۹)، ''شناخت'' (۲۰۱۱)، ''کالی پری'' (۲۰۱۳)، ''ریشم کا جال'' (۲۰۱۴)، ''پرچھائیاں'' (۲۰۱۷)، ''چاند نگر'' (۲۰۱۷)، ''پرائی آنکھیں'' (۲۰۲۰) منظر عام پر آئے ہیں۔ ''سپنوں کی چراندھ'' اور'' گھونسلے کی گھٹن'' نام سے ارمان شمسی کے اور دو افسانوی مجموعہ زیر طبع ہے۔

ارمان شمسی تقریباً ۱۶۰ افسانے لکھ چکے ہیں۔ ہندوستان کے مختلف جرائد ''آجکل'' (دہلی)، ''انتساب'' (بھوپال)، ''شاعر'' (ممبئی)، ''رنگ'' (دھنباد)، ''بیسویں صدی'' (دہلی)، ''شمع'' (دہلی)، ''آنند ڈائجسٹ'' (پٹنہ) میں متواتر چھپتے رہے ہیں۔انکی افسانوں کے بنگلہ ترجمے بھی ہوتے رہے ہیں۔جن کی اشاعت اخبارات ''جگنتھو'' اور'' جائے جائے دن'' میں ہوتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ ارمان شمسی کے

افسانوں کا بنگلہ ترجمہ جعفر عالم نے 'اردو گلپو' اور ''اوپ مہادیشیر اردو گلپو'' مترجم افسانوی مجموعے میں شامل کیا ہیں۔ اس کے علاوہ ''بنگلہ دیشیر اردو چھوٹو گلپو'' ۲۰۱۸ میں جلد اول اور ۲۰۱۹ میں جلد ثانی شائع ہوا ہے جس میں ہیکل ہاشمی نے ارمان شمسی کے دو افسانے کا بنگلہ ترجمہ شامل کیا ہیں۔

ارمان شمسی کا پہلا افسانوی مجموعہ ''آشنائی کا کرب'' میں 'منجدھار'، 'کھیل'، 'جیون ایک الاؤ'، 'بھونچال'، 'مہک'، 'آشنائی کا کرب'، 'میڈم راسپوٹن'، 'جواب'، 'درد کی تنہائیاں'، 'روشن دان'، 'جھوٹن'، 'چھوٹا گھر'، 'گلچیں کا خمار'، نامی ۱۳ افسانے شامل ہیں۔

ارمان شمسی کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''ڈھلان سے ابھرتا سورج'' میں 'ایک مٹھ ماٹی'، 'فیتاسی کنگڈم'، 'سپنے کا خوف'، 'ڈھلان سے ابھرتا سورج'، بقا کی خاطر'، 'ساوتری'، 'مرغ پلاؤ'، 'ضمیر کا زخم'، 'روزگار'، 'بھوک کا شکنجہ'، 'جھوٹے سپنے سچے خواب'، 'بھنور'، 'پگلی'، اور 'تاریک جھروکے' نام سے ۱۴ افسانے ہیں۔

ارمان شمسی کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''خواب ریزے'' میں 'نقطۂ نوگریز'، 'ممتا کی چاہ'، 'نمک حرام'، 'سلگتی روشنی'، 'کھلونا'، 'شکست وفا کے سایے'، 'رینگتی حسرتیں'، 'جنت کا متلاشی'، 'تشنہ کام'، 'پھولوں کے گھاؤ'، 'آتشی پھول'، 'خواب ریزے' نام سے ۱۲ افسانے ہیں۔

چوتھا افسانوی مجموعہ ''پیاسی ندیا'' میں 'سماج سدھار'، 'شب خون'، 'پیاسی ندیا'، 'بچھیا'، 'سناٹا'، 'مردانہ سماج'، 'اندھاپن'، 'سکھ'، 'عزت کی روٹی'، 'استغفراللہ'، 'گھٹن'، 'بیداری'، 'حنا کے زخم' جیسے ۱۳ افسانے شامل ہیں۔

ارمان شمسی کا پانچواں افسانوی مجموعہ 'شناخت'' ہے۔ اس میں ۱۳ افسانے ہیں۔ 'شناخت'، 'الماس نگر کے قیدی'، 'جنگل کا قانون'، 'بہاروں کی آہٹ'، 'اجڑتا درخت'، 'فطرت زدہ'، 'جلتی دھوپ ٹھنڈی چھاؤں'، 'موتی اگلتی سیپیاں'، 'سمجھوتے کا ہنر'، 'اعلیٰ نسل'، 'بڑے شہر کا باشی'، دلدل'، 'پڑوسی' اس میں شاملا فسانے ہیں۔

ارمان شمسی کا چھٹا افسانوی مجموعہ ''ریشم کا جال'' ہیں۔ اس میں 'ریشم کا جال'، 'کوڑھ'، 'آ گہی'، 'جنم جلی'، 'آنکھ مچولی'، 'تسمہ پا'، 'چیخ'، 'چمتکاری'، 'چارہ گر'، 'ہجرت زدہ'، 'فرض شناس' نام سے ۱۱ افسانے ہیں۔

ساتواں افسانوی مجموعہ ''کالی پری'' میں ''آسیب'، 'ہرجائی'، 'نیادور'، 'مردذات'، 'بوجھ'، 'سنجوگ 'نجمہ او نجمہ'، 'بنو خالہ'، 'وقت کے رنگ'، 'دہکتی جنت'، 'کالی پری'' جیسے ۱۱ افسانے شامل ہیں۔

ارمان شمسی کا آٹھواں افسانوی مجموعہ ''پرچھائیاں'' ہے۔اس میں 'پرچھائیاں'، 'جینے کی راہ'، 'بوائے فرینڈ'، 'احساس'، 'بلی کے بکرے'، 'گدھ'، 'جلا ہوا کارتوس'، 'مزدور عورتیں'، 'تارا'، 'وارث' نام سے ۱۰ افسانے ہیں۔

۹واں افسانوی مجموعہ ''چاندنگر'' میں 'چاندنگر'، 'ٹھنڈک'، 'آدمی کا پلا'، 'سن آف بنگلہ دیش'، 'نروان'، 'مسیحا'، کڑوا سچ'، 'حسن کی گنگا'، 'تاریک جھروکے'، 'گلابوں کے کھنڈر'، 'بن باس'، 'زنجیر رشتہ' جیسے ۱۲ افسانے شامل ہیں۔

دسواں افسانوی مجموعہ ''پرائی آنکھیں'' میں 'پرائی آنکھیں'، 'شکاری'، 'برہنہ بے کسی'، 'عہد ستم ختم ہوا'، 'سپنوں کی راکھ'، 'معصوم رسیا'، 'گل بانو'، 'سڑک کنارے'، 'حلالہ'، 'وظیفہ جاری رہیں گا'، 'نطفہ'، 'جنوں کے سائے' عنوان سے ۱۲ افسانے شامل ہیں۔

ارمان شمسی بنگلہ دیش میں مقیم ہیں۔ان کی پیدائش ہندستان کے یو پی صوبہ کے بریلی ضلع میں قصبہ آنولہ میں ہوئی۔ تاریخ ولادت ۲۱ اگست ۱۹۴۳ء بروز ہفتہ ہے۔والد کا نام منظور احمد اور والدہ کا نام نشا بیگم۔ان کی پیدائش کے ڈھائی سال بعد ان کے والد کی وفات ہوگئی۔اس وقت سے بہت غربت میں زندگی بسر کرنی پڑی۔ان کی امی نے تین بیٹیاں اوررارمان شمسی کو نہایت محنت و مشقت اور استقلال کے ساتھ پرورش کی۔ ارمان شمسی بہت ذہین ہونے کے باوجود تعلیمی سلسلہ کو آگے بڑھانے میں انہیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔وہ اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

> ''میں بچپن سے ہی حساس اور تیز تھا جو پڑھ لیا یاد ہوگیا۔ ہمیشہ فرسٹ آتا،قصبہ آنولہ میں ایک ماسٹر تھے پریم شنکر۔ان کی سی انگلش پورے قصبے میں کسی کی نہ تھی، اردو و فارسی و ہندی اور سنسکرت کے بھی ماہر تھے۔ مجھے گھر پر ٹیوشن پڑھانے آتے۔دس روپے فیس تھی۔ جبکہ اس

وقت ایک سودس روپۓ تولہ سونا تھا۔ میں خود دو دو روپۓ مہینے کی ٹیوشن پڑھاتا اور اسکول سے آکر ایک کارخانہ کی چورن بھرنے کیلئے کاغذ کی نلکیاں بناتا جس کی مزدوری ایک آنا فی سیکڑہ تھی۔ یوں لشتم پشتم ماسٹر صاحب کی دس روپۓ فیس کی ادائیگی ہو پاتی۔ پھر بہت جلد تھک گیا تو ماسٹر صاحب کو منع کر دیا مگر وہ کہاں ماننے والے تھے۔ حکم ہوا تم جیسے لڑکوں کا پڑھنا بہت ضروری ہے۔ اب تم پڑھنے کے لئے میرے مکان پر آیا کرو۔ یہاں انہوں نے ایک کوچنگ اسکول قائم کر رکھا تھا۔ وہ میرے سپرد کر دیا اور میں چھوٹے بچوں کو پڑھانے لگا خود بھی پڑھتا۔ ان کے یہاں بی اے کے لڑکے پڑھا کرتے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وردمیننگ اور ڈکٹیشن سب کا میرے ہی ذمہ تھا جب کہ میں خود انٹر میں تھا۔ میری محنت کے عوض ماسٹر صاحب نے میری فیس معاف کر دی۔" [۴]

انٹر تک تو وہ یوپی میں پڑھ لیا تھا۔ بعد میں وہ غربت کے مارے کولکاتا آ گیا۔ ایک دکان پر سیلز مین کی ملازمات شروع کی۔ وہ ملازمت کے ساتھ ساتھ پرائیوٹ امتحان میں شریک ہوتے رہے۔ جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب اور ادیب ماہر میں فرسٹ اور کامل میں سکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔ بی اے کا داخلہ لیا تو تھا لیکن ۱۹۶۴ میں کلکتہ میں فساد ہو گیا، کالج کا مکان بھی جلا دیا گیا، ابتری پھیل گئی تو ہجرت کرنا پڑا اور سلسلہ تعلیم بھی بند ہو گیا۔

تنگ دستی کی وجہ سے دکان کی ملازمت کرنی پڑی۔ بڑی مشکل سے گھر کی اخراجات کا گزارہ ہوتا تھا۔ ان کی فیملی کی بری حالت کو اپنی افسانے "گلچین کا خمار" میں اپنی بہن کی شادی کی بات کو افسانوی پیرایہ میں اظہار کرتے ہیں:

"آپ تو قیامت آجائے گی جب بھی یہی کہیں گے کچھ نہیں ہوا۔"

جواب میں چندامیاں جھلاّ کر بولے "یہ جو تم نے مہ پارہ کی بات طے کر رکھی ہے یہ لڑکا کون ساتمیں مارخاں ہے۔ جانتی ہو.....اس کے چال چلن کے لیے جب پوری برادری نے اس کو نہیں پوچھا تو انھوں نے تمھارے گھر کا رخ کیا ہے اور اگر وقت پر جہیز وغیرہ کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تو کیا کروگی ہے کچھ پاس پلّے؟ عمر بھر بیٹیوں کو کوٹھے سے لگائے رکھنا یا ایک دن صبح اٹھ کر انہیں

ملتے ملتے دیکھنا کہ وہ گھر سے بھاگ گئیں۔نفیسہ ابھی تو فاقے فقر سے کٹ رہی ہے لیکن ذرا آنے والے خوفناک دنوں کے بارے میں سوچو...؟ میں نے مانا تمھاری بیٹیاں خوبصورت ہیں،حسین ہیں لیکن میری بہن صورت کے ساتھ ساتھ لوگ کچھ اور بھی چاہتے ہیں جس میں مال دولت،عزت،خاندان وغیرہ سب کچھ ہی شامل ہے۔اس سماج میں غریب کی عزت ہی کیا ہے اور وہ بھی گھر گھر گھوم کر کپڑے سینے والی کی؟

چندا میاں نے جذبات میں بھر کر سچ کا زہر ایک ہی سانس میں اگل دیا جیسے کوئی مینڈک زہریلے سانپ کا من گھبرا کر اگل دے اور اب روشنی ہی روشنی تھی جس سے نفیسہ بانو کی آنکھیں چندھیائی جارہی تھیں۔انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپا اور گہری گہری سانسیں لینے لگیں۔

پھر چندا میاں یہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔"تم اچھی طرح غور کرلو۔میں کل آؤں گا۔"

دوسرے دن جب چندا میاں بہن کے گھر پہنچے تو نفیسہ بانو منہ سر لپیٹے پڑی ہوئی تھیں۔مہ پارہ اور قمر آرا دونوں سینے پرونے کے کام میں مصروف تھیں۔بہن کو اٹھایا۔حال پوچھا تو معلوم ہوا آج صبح سے چولھا نہیں جلا ہے۔سب کو فاقہ ہے۔دونوں لڑکیاں کام مکمل کررہی ہیں پیسے آئیں گے تو چولھا جلے گا۔چندا میاں الٹے قدموں واپس ہوگئے۔گھر سے کھانا لائے سب کو کھلایا۔پھر بہن سے مخاطب ہوئے"تم اپنا دل چھوٹا مت کرو،چھوڑ و اس رشتے کی بات کو۔اپنا کام دھندا دیکھو۔اللہ مالک ہے،وہ جیسا چاہے گا وہی ہوگا۔"[۵]

ان کی مفلسی ایک دن ختم بھی ہوگئی تھی۔تجارت میں ساڑھے بارہ فی صد شرکت بھی مل گئی۔دو برس دکان میں پارٹنر رہے۔۱۹۶۴ء میں ہندو مسلم فساد شروع ہوا تو وہ کولکاتا سے ڈھاکہ ہجرت کرکے چل آئے۔ ڈھاکہ میں دو برس بہت بدحالی میں گزرے،کوئی ملازمت بھی نہ ملی۔آخر ایک تجارت کا بندوبست ہوا تھا۔ اس تجارت کی اونچ نیچ اور ترقی اور تنزل کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"آخر اپنے ایک دیرینہ دوست سے کچھ رقم قرض لی اور ساڑھے تین سو روپے میں ایک بند پڑا ہوا پلاسٹک کا سامان بنانے کا کارخانہ خریدا جس میں صرف دو ہینڈ مشینیں تھیں اور

بال پین بنانے کا کام شروع کر دیا، کام چل نکلا اور میں ترقی کی راہ پر لگ گیا۔ایک بار پھر تعلیم کی فکر ہوئی تو میں وائی ایم سی اے YMCA کا ممبر بن گیا۔تعلیم جاری کر دی لیکن قسمت پھر جُل دیا۔ بنگلہ دیش کی تحریک شروع ہوگئی اور انقلاب کے بعد جب بنگلہ دیش بنا تو میں برباد ہو چکا تھا۔ ہاتھ خالی تھے، کاروبار بند تھا، دوبارہ کارخانہ کھولا، قسمت سے زور آزمائی شروع کر دی۔نتیجہ یہ ہے کہ آج میری فیکٹری میں تین آٹو میٹک مشینیں چل رہی ہیں ،کاروبار لاکھوں تک پھیل گیا ہے، اپنی فیکٹری کا میں اکاؤنٹنٹ اور ٹیکنیشین بھی خود ہی ہوں۔ ڈائیاں اور مشین تک بنالیتا ہوں۔ یہ سب میری والدہ کی کوششوں اور دعاؤں کا ثمرہ ہے اور شاید میری ترقی کی وجہ میرا سماج اور متمول اعزا کا وہ رویہ بھی ہے جب لوگوں کی نگاہوں میں میں اپنے لئے ہلکا پن اور تحقیر دیکھتا تھا، اپنی اس بے توقیری نے میرے اندر ایک آگ بھر دی۔ایک جنون پیدا کر دیا اور آج خدا کا شکر ہے کہ میں ہم سری کا دعویٰ کر سکتا ہوں۔" [۶]

انہوں نے ایام طفلی سے دیکھے ہوئے غربت اور افلاس کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ان کا پہلا افسانہ تو ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔ [۷] اس کا نام "بھوک کا شکنجہ" سے پتہ چلتا ہے اس کا موضوع کیا تھا۔ یہ افسانہ دہلی کے عوامی رسالہ " بیسویں صدی" میگزین میں شائع ہوا۔اس کے بیس سال بعد ۲۰۰۳ء میں پہلا افسانوی مجموعہ " آشنائی کا کرب" شائع ہوا بیسویں صدی میگزین مطبع سے۔اس پہلے مجموعہ کے لیے بہار اردو اکیڈمی، ہندوستان کی جانب سے ان کو ایوارڈ ملا تھا۔اس سے ارمان شمسی کی فکر وسوچ کو مزید حوصلہ افزائی ہوئی۔ [۸]

بنگلہ دیش میں رہتے ہوئے اردو افسانہ نگاری دراصل بہت مشکل ہے۔افسانہ شائع ہونے کے بعد افسانہ نگار کی ہمت اور بڑھ جاتی ہے۔لیکن بنگلہ دیش سے تو کوئی رسالہ شائع نہیں ہوتا ہے۔ بیرون ملک سے افسانہ شائع کرنے کے لیے بھیجنے کے بعد انتظار میں بہت وقت گزر جاتا ہے۔اسی حالت کو ارمان شمسی ۱۵ اپریل ۲۰۰۷ء کا ایک خط میں لکھتے ہیں:

"دراصل میں تو یہ سمجھ رہا تھا مذکورہ افسانہ "ریشم کا جال" آپ کے یہاں چھپ چکا ہوگا۔کسی بھی افسانے کی مجھے خبر نہیں ملتی کہ وہ کب شائع ہوا، ہوا بھی یا نہیں۔عموماً اسی

پرچے کی جانب سے مجھے خبر مل جاتی ہے۔ یا رسالہ پہنچ جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں بنگلہ دیش میں اردو کے پرچے نہیں آتے۔"[9]

ارمان شمسی بنگلہ دیش میں بیٹھ کر ساری دنیا سے رابطہ رکھتے ہیں۔ وہ مشہور سب افسانہ نگاروں کے افسانہ پڑھتے ہیں اور کبھی کبھی متاثر بھی ہوتے ہیں۔ وہ خود اس کے بارے میں لکھتے ہیں: "اس میں شک نہیں کہ منٹو مجھے پسند تھا۔ لیکن عصمت، بیدی، کرشن چندر، قرۃ العین، پریم چندر، علی عباس حسینی اور خواجہ احمد عباس نے بھی متاثر کیا۔"[10]
وہ صرف مذکورہ افسانہ نگاروں سے ہی متاثر ہوئے، یہ نہیں بلکہ وہ بنگلہ دیش کے سماج، معاشرہ، سیاست، تہذیب اور مہاجروں کی سنگین مسائل سے متاثر ہو کر افسانے لکھتے رہے۔ وہ خود "پرچھائیاں" میں لکھتے ہیں:

"میں جس ملک میں سکونت پذیر ہوں وہاں کی زبان و تہذیب و تمدن گو کہ ہند و پاک سے قدریں مختلف ضرور ہے۔ لیکن مسائل انسانی ایک جیسے ہی ہیں، افلاس ہے، لوٹ گھسوٹ ہے، استحصال ہے یعنی وہ سب کچھ ہے جو ایک غریب ملک کے لئے ناگزیر ہوسکتا ہے۔ ایک ادیب جب اس دکھ کو محسوس کرتا ہے تو وہ خود بھی دکھی ہوجاتا ہے۔ اور جب وہ قلم اٹھاتا ہے تو صفحہ قرطاس پر دکھ پھیل جاتے ہیں۔ پھر یہ دکھ قاری بھی محسوس کرتا ہے۔ قاری کا یہ دکھ معاشرے کا مداوا بھی بن سکتا ہے۔ ایک ادیب اسی امید پر اپنے دن رات کا چین تیاگ کر کہانیاں بُنا کرتا ہے۔
ان سماجی مسائل کے علاوہ ایک اور مسئلہ میرے دل و دماغ میں جاں گزیں رہتا ہے وہ ہے مہاجرت اور مہاجروں کی کسمپرسی گو کہ یہ واقعہ ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد وقت کی دھول میں دب کر ماند پڑ گیا ہے لیکن مسئلے کی سنگینی اپنی جگہ موجود ہے اس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی تقسیم ہند کے زمانے میں جو قتل و غارت گری ہوئی اس پر پاک و ہند دونوں جانب سے کافی کچھ لکھا گیا۔" پر افسوس! سقوط پاکستان کے بعد بنگلہ دیش میں اردو زبان اور اسکے بولنے والوں کی جو درگت بنی اس پر نہیں لکھا گیا۔ میں ہندوستان جاتا ہوں تو آج بھی اردو حلقہ اپنی زبان کے بارے میں پوچھتا ہے دیوانہ تو مر گیا "لیلیٰ پہ کیا بیتی"[11]

ارمان شمسی کے افسانوں کا کردار حقیقی ہوتا ہے۔دلکش انداز سے روزمرہ پیش آنے والا واقعات کو بڑی آسانی سے افسانہ کی شکل دے دیتے ہیں۔ارمان شمسی ان کی افسانہ نگاری کا موضوع عموماً کیا ہوتا ہے اس کے بارے میں مرزا رفیق شاکرایک تبصرہ میں ذکر کرتے ہیں:

> ارمان شمسی اپنے ماحول،سماج،مذاہب اور تہذیب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ عمیق اور مطالعہ بہت زیادہ ہے۔وہ بچہ،مزدور،غریبی،مفلسی،سرمایہ دارانہ طبقے کی جنس پرستی اکثریتی فرقے کے مظالم،حکومتی اداروں کی عیاری انسانی نفسیات طبقاتی نابرابری جیسے موضوعات پر لکھتے ہیں۔
> ارمان شمسی کی زبان سلیس اور رواں ہے۔جس میں ادب کی چاشنی ہے۔استعارے اور کنایہ کے ذریعہ بہت کچھ کہہ دیتے ہی۔جہاں کچھ نہیں کہتے وہاں بھی قاری پر گہری چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔[۱۲]

ارمان شمسی اپنے افسانوں کا پلاٹ اپنے ماحول سے متاثر ہوکر منتخب کرتے ہیں۔وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ان کی نوجوانی اسی جگہ گزری۔اس لیے ہندوستانی شعور،جذبات اور بنگلہ دیشی تجربہ کومخلوط کرکے وہ انوکھے پلاٹ تیار کرتے ہیں۔جس میں قاری ڈوب کرافسانوں کے پلاٹ اور کرداروں میں اپنے ماضی کی تصویریں دیکھتے ہیں۔یہاں شدت احساس اور گہرے تجربے کا بھرپور عکس ملتا ہے۔وہ نئے حالات، نئے مسائل کو اپنے افسانے میں جگہ دینا پسند کرتے ہیں۔ان کے طرز تحریر،موضوعات اور پلاٹ کے بارے میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی لکھتے ہیں:

> ارمان شمسی نے بےحسی،بےغیرتی،جبروظلم اور ناعاقبت اندیشی وخودغرضی جیسے موضوعات کو بھی افسانے کا حصہ بنایا ہےاور ٹوٹتے بکھرتے نظام کے معاشرتی پہلو کا مطالعہ پیش کیا ہے۔علامت تجریدیت اور وجودیت کے فلسفے سے وہ متاثر ضرور ہیں لیکن بیانیہ انداز کی ایک الگ راہ انہوں نے اپنائی ہے۔
> حقیقت نگاری سے چل کر علامت تک کا سفر طے کرکے ابلاغ سے بچ نکلنا ان کی فنکاری ہے۔زبان ومکان کے روشن مسائل کے تاریک پہلوؤں کی ترجمانی جس

مخصوص انداز بیان سے کرتے ہیں اس اسلوب سے نئے تقاضے کا ٹریٹمنٹ سامنے
آتا ہے اور ارمان شمسی کے افسانوں کی جہت نمایاں ہوتی ہے۔"[۱۳]

ارمان شمسی افسانوں میں کردار پر بہت زور دیتے ہیں۔ افسانے کے خاطر کردار منتخب کرتے ہیں۔ ہر کردار کی زبان و لہجے کو بھی الگ الگ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی کردار نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے شمیم زمانوی لکھتے ہیں۔

"وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ کردار نگاری کیا چیز ہے اور کردار کی زبان کیسی ہونی چاہئے۔ ان کے یہاں گھر کی چہار دیواری کی بیگمات اور بازار کی زبان میں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ طوائف اور دلال کے لب و لہجے میں کیا باریک سا فرق ہونا چاہئے اور اس کے مؤکل کا طرز گفتگو کیسا ہو؟ غرضیکہ وہ اہل زبان ہیں اور اپنے کرداروں کی زبان بامحاورہ انداز میں بہت خوبی سے نبھاتے ہیں۔"[۱۴]

مکالمے افسانے کو قاریوں کے نزدیک بہت مقبول بنا دیتا ہے۔ جب مکالمہ حقیقت پر مبنی ہو تو یہ اور بھی دلچسپ ہو جاتا ہے۔ ارمان شمسی نے اپنی زندگی میں بھوک کو سامنے سے دیکھا۔ ایک فاقہ مست انسان کی سوچ اور بات چیت کس طرح کی ہو سکتی ہے اسے ارمان شمسی کے افسانہ "بھوک کا شکنجہ" میں دیکھیں۔

"جب فاطمہ بی بی کے سامنے ٹرے میں گرم گرم بھات، شوربہ، دال اور کدّو کی بھاجی آئی تو ان کی تو باچھیں ہی کھل گئیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دو روز کی فاقہ کشی کے بعد اچانک عین دوپہر کھانے کے وقت روزہ کشائی گرما گرم کھانے سے ہوگی۔ انہوں نے اپنی ملگجی آنکھوں سے اسٹول پر رکھی ہوئی ٹرے کو جھک کر اچھی طرح سے دیکھنا چاہا تو چاولوں سے اٹھتی ہوئی گرم بھاپ تیر کی طرح ان کے نتھنوں میں گھستی چلی گئی اور بے اختیارانہ ان کے منہ سے خوشی کی ایک قلقاری نکل گئی۔

مگر اچانک کسی خیال سے ان کے دماغ پر یاسیت چھا گئی اور وہ بڑی حسرت سے اپنی کھوئی کھوئی آنکھوں سے اس کھانے کو تکنے لگیں۔ غیر شعوری طور پر ان کی گرفت کھانے کی ٹرے پر مضبوط

سے مضبوط تر ہوتی جارہی تھی اور وہ سحر زدہ سی اپنی کانپتی ہوئی ٹانگوں کو لرزنے سے روکنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھیں کہ ایک نرس کا ادھر سے گذر ہوا اور اس نے ڈپٹ کر کہا۔

''اے بڑھیا کیا کر رہی ہے۔ کھانا کیوں نہیں کھالیتی، یوں ہی ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' فاطمہ بی بی نے بے اختیاری میں نرس کا ہاتھ تھام لیا اور بولیں۔

''میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔''

نرس نے بڑی نخوت سے ان کی طرف دیکھا اور کرخت لہجے میں بولی

''تجھ سے پیسے دینے کو کون بولتا ہے خواہ مخواہ بدنام کرتی ہے یہ کھانا مفت ہے۔''

اور ''کھانا مفت ہے۔'' ''کھانا مفت ہے۔'' ''کھانا مفت ہے۔'' کی بازگشت فاطمہ بی بی کے کانوں کے گرد طواف کرتی رہی۔ دراصل انھیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا کہ قسمت اس طرح بھی مہربان ہو سکتی ہے۔ انہوں نے گھبرا کر نرس سے پوچھا۔ ''تو کیا میں کھانا کھالوں!' نرس نے جھنجلا کر کہا۔

''ہاں ہاں کھاؤ نا روکا کس نے ہے تمہیں۔'' نرس کی آواز سنتے ہی فاطمہ بی بی کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی اور ان کے کمزور فاقہ زدہ ہاتھ باز کے مضبوط پنجوں کی طرح کھانے کی طرف لپکے مگر وہاں کسی قسم کی مزاحمت تو تھی نہیں کہ کھانے میں دشواری ہوتی وہاں تو سیدھے سادے ابلے ہوئے چاول اور ترکاری تھی۔

ایک بار وہ ملغوبہ مٹھی کے شکنجے میں پھنستا تو سیدھا حلق کی راہ پیٹ کے اندھے کنوئیں میں دھنستا چلا جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا تھال خالی ہو گیا۔ تھال سے منہ لگا کر فاطمہ بی بی نے بچی کھچی دال بھی غٹ سے چڑھالی اور پھر پانی کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

ہسپتال کی پوری گیلری میں بیڈ ہی بیڈ تھے اور ان کے پاس اسٹول رکھے تھے جن پر کچھ عورتیں بیٹھی اب بھی کھانا کھا رہی تھیں۔

پاس سے گزرتی ہوئی نرس کو انھوں نے روک کر پوچھا۔

''کیا پانی مل سکتا ہے؟'' نرس نے قہر آلود نگاہوں سے انہیں دیکھا اور ان سے بولی۔ ''ہم کیا تمھارے نوکر ہیں جو پانی بھی لاکر دیں۔ باہر نل لگا ہوا ہے خود جا کر پانی پی لو۔'' [۱۵]

ارمان شمسی نے غربت کو خاص طور پر اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔'ڈھلان سے ابھرتا سورج'،'ساوتری'، 'مرغ پلاؤ'،'ضمیر کا زخم'، 'بھوک کا سکنجہ'،'گلچین کا خمار' وغیرہ افسانہ میں فاقہ زدہ انسان کی تصویر کشی کا حق پوری طرح سے ادا کرتے ہیں۔

ارمان شمسی مذہب پسند شخص ہیں۔ان کے آباواجداد مذہبی عالم تھے۔وہ خود لکھتے ہیں۔

''میرے چچا مرحوم جو عنفوان شباب میں رحلت کر گئے دیو بند کے عالم اور دستار بند تھے۔ دادا بھی قصبہ کے مشہور عالم مانے جاتے تھے۔میری پیدائش کے تین سال بعد ہی میرے والد اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔'' ١٦

انہوں نے مذہبی لوگوں کو قریب سے دیکھا۔'منجدھار' افسانہ میں گاؤں کے قرآنی مکتب کا ایک نقشہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

''بری بانو اپنی حویلی کے لق ودق آنگن میں چٹائی پر بیٹھی دھوپ کھاتی جارہی تھیں اور بچوں کا سپارہ بھی سنتی جارہی تھیں۔سامنے قطار سے بیٹھی بچے اپنا اپنا پچھلا سبق لہک لہک کر پڑھ رہے تھے جہاں کوئی اٹکتا یا غلطی کرتا تو وہ فوراً ہی اس کو ٹوک کر تصحیح کرتیں اور پوری آیت دہرادیتیں۔ طالب علم پھر فرّاٹے بھرنے لگتا۔ ہر روز وہ کوئی درجن بھر بچوں کی آوازوں پر کان لگائے بیٹھی رہتیں۔گو کہ وہ حافظہ نہیں تھیں پر مہارت کا یہ عالم تھا کہ پورا قرآن شریف انھیں از بر تھا۔ اب یہ ان کا مشغلہ بھی بن گیا تھا اور ضرورت بھی کہ وہ دن بھر بچوں کے ساتھ سپارے رٹتی رہیں ۔کوئی آل نہ اولاد اگلے پچھلے سب مرکھپ چکے تھے۔حویلی میں ان کے علاوہ ان کی ایک پھوپی تھیں۔ وہ بھی جب لیٹے لیٹے اکتا جاتیں تو پاس آکر بیٹھ جاتیں اور بھول ہونے پر لقمہ دینے لگتیں۔'' ١٧

ارمان شمسی کی نگاہ انسانی نفسیات پر بہت گہری ہے۔انسانی جبلت اور نفسیات کے موضوع پر انھوں نے بہت افسانے لکھے ہیں۔ان میں ایک افسانہ'اسیر فطرت'۔اس افسانہ میں دیکھا جاتا ہے کہ ایک طالب علم راتوں کو چھپ چھپ کر بند کمرے میں موسیقی اور غنائیت میں مشغول ہو جاتا ہے لیکن تنگ نظر معاشرے کی

نگاہوں سے وہ بچ نہیں پاتا۔اس کوسزادی جاتی ہے۔اس کہانی کے بارے میں شمیم زمانوی لکھتے ہیں:

> یہ انسانی فطرت اور روایت کے مابین تصادم کی ایک عمدہ کہانی ہے۔افسانہ پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں سوال ابھرتا ہے کہ کیا مولوی کو انسان نہیں فرشتہ ہونا چاہیے؟ جو دنیا کی تمام لذتوں سے منہ پھیر کر صرف قال اللہ اور صوم وصلوۃ تک ہی محدود رہے۔یا پھر حلال وحرام کے دائرے میں رہتے ہوئے اس دنیا کی نعمتوں سے مستفیض ہونے کا اسے بھی حق ہے۔[۱۸]

ارمان شمسی مذہبی تعصب کے خلاف تھے۔تعصب سے معاشرہ کا کیا نقصان ہوتا ہے اس کی نشاندہی کرتے ہوئے بابری مسجد کے بارے میں وہ لکھے ہیں:

> ''میرا استغراق اس وقت ٹوٹا جب میری سماعت سے لا الہ کی عظیم صدا ٹکرائی۔میں نے اپنا سراٹھا کر جامع مسجد کے میناروں کو دیکھا۔یہ سرزمین ہند پر پھیلے ہوئے ہزاروں مینار اپنی دلکش میں بے مثال مساجد، مقابر، قلعے یہ سب کس کا سرمایہ ہیں۔ہمارا.....ہم سب کا......مسلمانوں کا.....ہندوؤں کا، ہندستانیوں کا۔ پھر ہم اپنے سرمائے کے دشمن کیوں ہیں؟ بابری مسجد کیوں منہدم کردی گئی۔اب متھرا اور کاشی کی مساجد کے انہدام کی باتیں ہورہی ہیں تو کیا....تو کیا کل بات تاج محل اور لال قلعے تک بھی پہنچ سکتی ہے..... ہاں ہاں.....! نفرت اور تعصب کے الاؤ میں سب کچھ جل سکتا ہے۔اپنا گھر بھی بلکہ اپنا وجود بھی۔''[۱۹]

ارمان شمسی منظر نگاری میں اچھا خاصہ دخل رکھتے ہیں۔جس چیز کا منظر پیش کرتے ہیں وہ گویا قاری کے سامنے نظر آنا شروع ہوجاتا ہے۔منظر نگاری کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

> ''عروسہ نے پہلے منع کیا پھر سلطان کے آگے اسکی نہ چل سکی طے پایا کل صبح سات بجے دونوں روانہ ہوجائیں۔
>
> 'پتایا (Pataya) کے ساحل پر پہنچ کر عروسہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔حد نگاہ تک ہلکورے لیتے ہوئے نیلے سمندر پر چھوٹی چھوٹی رنگین بادبانی کشتیاں تیرتی پھر رہی تھیں۔ساحل کے کنارے کنارے زعفرانی رنگ کا موٹا بالو بکھرا ہوا تھا اور نیلی پیلی بڑی بڑی چھتریوں کے سائے میں لوگ لانگ چیر پر نیم دراز سمندر سے اٹھتی ہوئی موجوں کا نظارہ کررہے تھے۔دور

ساحل کے کنارے کنارے ایک ہی ڈیزائن پر بنی سفید عمارتوں بڑا خوش نما منظر پیش کر رہی تھیں۔نم آلود ہوا سبک ردی سے بہہ رہی تھی کبھی کبھی ہوا میں کچھ تیزی آ جاتی تو پچھلی جانب سڑک کے کنارے قطار در قطار کھڑے ناریل کے درخت جھوم اٹھتے۔

واقعی بہت خوبصورت ساحل ہے عروسہ بے خود ہوکر بولی!''[20]

وہ افسانہ نگاری صرف دلجوئی کے لئے نہیں کرتے بلکہ ہر پراگراف سے قاری کو بہتر زندگی کی طرف بلاتے ہیں۔وہ مبلغ کی حیثیت انسان کو اچھے سے اچھے تر ہونے کا مشورہ دیتے ہیں۔ازدواجی زندگی میں پیش آنے والا کشمکش کو دور کرنے کے لئے 'بوجھ' افسانے میں لکھتے ہیں۔

''فرحت جہاں کی بات کی گہرائی کو سمجھتے ہوئے میں نے معین سے کہا آپ انہیں ایک مہینے کا خرچ اور رامپور کا ٹکٹ دے کر ٹرین میں سوار کرا دیجئے۔رامپور کے اسٹیشن پر ان کے ابا ان کو لینے آ جائیں گے۔ان کے ہمراہ خود آپ کو جانے کی ضرورت نہیں ہے۔آپ دونوں کو چاہئے کچھ دن الگ رہیں۔پھر یہ دوری خود بخود اکتاہٹ اور بیزاری کو چاہت اور رفاقت میں تبدیل کر دے گی جتنے دن آپ لوگ ایک دوسرے سے علیحدہ رہیں گے۔اتنا ہی محبت میں اضافہ ہوگا چاہئے آزما کر دیکھ لیجئے۔

میں نے جواب طلب نظروں سے معین کی جانب دیکھا تو انہوں نے گردن جھکا لی خاموشی نیم رضامندی کو سمجھتے ہوئے میں نے فرحت سے کہا آپ مائیکے جانے کی تیاری کیجئے۔''[21]

دوسری شادی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

''اے ہے خیال نہیں معلوم ہوتا ہے میں کیا خاک نامحرم کو ہاتھ لگاؤں گی؟ ذرا لحاف بھی چاروں طرف ٹھیک سے لپیٹ دینا تا کہ ٹھپ آ جائے۔پھر دونوں میاں بیوی انکے پاس بیٹھے انہیں سمجھاتے رہے۔تمام باتوں کا لب لباب ایک ہی تھا کہ میاں جی کو نکاح کر لینا چاہئے۔اچانک بڑی بی بولیں اے ہے میں کہوں میاں جی کی آنکھ لگ گئی ہے اور میں نگوڑی ماری بک بک کئے جا رہی ہوں چلو اٹھو انہیں آرام کرنے دو۔جب دونوں میاں بیوی چلے گئے۔تو مقبول حسین

نے جودم سادھے ایک ہی کروٹ پر پڑے ہوئے تھے کروٹ بدلی اوراپنے خیالوں میں کھو گئے ۔میں بڑھاپے میں قدم رکھ رہا ہوں اورلڑکی جوان ہے۔لیکن یہ مناسب نہیں ہوگا مگرلڑکی بیوہ بھی تو ہے؟ جوان ہےتو کیا ہوا؟ شریف بھی ہےاور غریب ومجبور بھی اسکے ساتھ نبھ سکتی ہے۔ نہیں.... نہیں میں ایسا نہیں کرسکتا، نجمہ بھی شریف تھی۔ نجمہ کا خیال آتے ہی انھوں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں کھول دیں پر دوسری جانب کروٹ بدلی تو کمر میں ایک زوردار ٹیس اٹھی اوراس کے ساتھ ہی درد کی لہروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔تو وہ بےاختیار کراہنے لگے۔پھران کی سماعت سے بڑی بی کی آواز ٹکرائی یہ کم بختوں کا مارا بخار ہووئے ہے،تو کمر تختہ ہو جاوے ہے۔ بدن الگ دکھتا ہے۔اب بھلا ان کا بدن کون دابے؟ نکاح کرتے نہیں۔نکاح کر لیتے تو دکھ سکھ کا سہارا ہو جاتا۔'' وہ سوچتے رہےاور کراہتے رہے آہستہ آہستہ بخار نے تیزی پکڑ لی اوران پر غفلت طاری ہوگئی۔پھرانکی بڑی ہمشیرہ کی آواز سنائی دی ''مقبول حسین لو یہ دوائی کھالو۔بھلا ایسے کیسے کام چلے گا۔تم نے اپنی یہ کیا گت بنا رکھی ہے، بچے اسکول کالج چلے گئے اور تم تنہا ایک ایک بوند پانی کو ترس رہے ہو،مرنے والی مرگئی اب لوٹ کرتو آتی نہیں،تم مرد بچے ہو،مرد ہی شادی کیا کرتے ہیں۔ایک یا دو یا چار چار بھی۔ یہ تمہاری ضرورت ہے۔ پر کیا شرمانا کہ اولادیں بڑی ہیں کیا سوچیں گی،اب تم ٹھیک ہوتو خیر سے نکاح کرادوں گی'' [۲۲]

ارمان شمسی نے جگہ جگہ سچی محبت اورمجازی عشق میں بھی فرق دکھانے کی کوشش کی ہے۔ان کا افسانہ'خواب ریزے'میں دیکھا جاتا ہے اپنی معشوقہ کی خاطر معشوقہ کے شوہر کی تندرستی کے لئے اپنا گردہ دے دیتے ہیں ۔گردہ دینے کے بعداس عاشق کی موت ہوجاتی ہے۔ناصر کی محبت کوارمان شمسی اس طرح پیش کرتے ہیں:

''وہ لڑکی عروسہ کا گریبان چھوڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔پھراس نے عروسہ کو مخاطب کر کے اس سے انگلش میں پوچھا تم ہی عروسہ ہو؟ بتاؤ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جوتم نے میرا محبوب مجھ سے چھین لیا؟

سلطان نے آگے بڑھ کرلڑکی سے سوال کیا تم انہیں کیسے جانتی ہو؟

میں توتمھیں بھی پہنچانتی ہوں غالبًا تمہارا نام سلطان ہےاورتم عروسہ کے شوہر ہو جس کا آپریشن

ہوا ہے۔ تمہیں شاید خبر بھی نہیں تمہاری حالت بگڑی تو اسپتال میں گردہ دستیاب نہیں تھا جانتے ہو
تمہیں گردہ کس کا لگا ہے؟
سلطان نے نفی میں گردن ہلائی تو وہ بولی......ناصر کا.....
ناصر کا عروسہ چیخ پڑی مگر ناصر ہے کہاں؟
وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا وہ تو تمہارے نام کا دیوانہ تھا۔ ستم رسیدہ پاگل اور ایک کامیاب مصور
وہ تمہیں بھلانا نہیں چاہتا تھا اس وجہ سے وہ تمہاری ہر سال ایک تصویر بنایا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا
دیکھو میری عروسہ میں کتنی تبدیلی آتی جارہی ہے۔" ۲۳

ارمان شمسی نے بچوں کی نفسیات پہ لکھا 'فینٹاسی کنگڈم' افسانہ لکھا۔ اس افسانے میں بچے سیر کے لئے جاتے ہیں۔ ان بچوں کے ساتھ گھر کا نوکر بھی جاتا ہے۔ بچے تو فینٹاسی کنگڈم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ لیکن گھر کا نوکر منان کو باہر ہی رکنا پڑتا ہے۔ اس لیے منان پھر ارادہ کرتا کہ ایک روز وہ بھی خود یہاں آئے گا۔ پھر وہ تنخواہ سے کچھ کچھ رقم جمع کر کے فینٹاسی کنگڈم میں جاتا ہے۔ لیکن ٹکٹ کے لائن میں ہی اس کی جیب کتر جاتی ہے۔ اس وجہ سے ان کو فینٹاسی کنگڈم میں داخل ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کہانی کی اختتامی دو پراگراف ملاحظہ ہو:

"لائن دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ اچک اچک ٹکٹ کاؤنٹر کو دیکھتا اور کبھی اپنے آگے کھڑے ہوئے لوگوں کی گنتی گنتا کہ اب کتنے آدمی رہ گئے ہیں۔ خدا خدا کر کے وہ ٹکٹ کاؤنٹر تک پہنچا تو اس نے اپنی گردن کو خم کر کے ایک ادائے بے نیازی سے ٹکٹ بابو کو دیکھا اور پتلون کے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تو اس کا ہاتھ جیب سے پھسل کر یوں باہر نکل گیا جیسے جیب میں گھلا ہوا صابن لگا ہو۔ اس نے گھبرا کر اپنی کٹی ہوئی جیب کو دیکھا اور جلدی جلدی اپنی پتلون کی دوسری جانب کی جیبیں ٹٹولنے لگا مگر وہ تو سب خالی تھیں۔
آن کی آن میں جیسے کسی نے اسے آسمان سے نیچے دھکیل دیا۔ وہ نیچے اور نیچے گرتا ہوا زمین سے آٹکرایا۔ ایک دھماکہ ہوا۔ فینٹاسی کنگڈم کے جلتے بجھتے قمقموں کا فیوز اڑ گیا۔ چاروں طرف سے اندھیرا ہی اندھیرا۔ وہ گلا پھاڑ کر چیخا۔" ہائے میرے روپیے ...میری جیب کسی نے کاٹ لی...."

اس کو روتا بلکتا دیکھ کر دومنٹ کے لئے ٹکٹوں کی بکری رک گئی۔ آس پاس کھڑے لوگوں نے اس کی بات سنی۔ اس سے دریافت کیا کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔ کچھ لوگوں نے ہمدردی کے بول کہے اور کچھ کے چہروں پر یہ دکھ کے سائے بھی لہرائے تاہم ٹکٹوں کی فروختگی دوبارہ شروع ہوگئی۔ لوگ اسے دیکھتے، ہمدردی سے سر ہلاتے ٹکٹ خریدتے اور فینٹاسی کنگڈم میں داخل ہوتے رہے۔"[۲۴]

مذکورہ افسانے میں معاشرہ کی تنگ دستی دکھائی گئی ہے۔ اس میں سب سے زیادہ تنگ رہتے ہیں بنگلہ دیش میں مقیم اہل اردو۔ یہ لوگ تو پہلے یو پی یا بہار سے سابق مشرقی پاکستان موجودہ بنگلہ دیش میں آئے تھے۔ ۱۹۷۱ء کے بعد ان لوگوں کی زندگی میں بہت نشیب وفراز آئے ۔کہیں کہیں تو قتل عام بھی ہوا۔ جس تسکین اور سرور کے لیے لوگوں نے گھر چھوڑا تھا وہ آج بھی شاید پورا نہیں ہوا۔ پھر بھی بنگلہ دیش میں وہ لوگ آج تک مقیم ہیں۔ بنگلہ دیش کے ساڑھے ۳ لاکھ لوگ کی مادری زبان آج بھی اردو ہے۔ وہ روانی کے ساتھ اردو کہہ سکتے ہیں۔ ۱۹۹۹ سے یونیسکو نے ۲۱ فروری کو یوم مادری زبان اعلان کیا ہے۔ اس دن کے بعد ہر شخص اپنی مادری زبان میں بات چیت کرنے کا پورا حق رکھتا ہے۔ اردو والے بھی اردو زبان وادب کی ترقی میں جان توڑ کر محنت کر رہے ہیں۔ اس وقت "ڈھاکہ یونیورسٹی سے جرنل آف اردو" نام سے تحقیقی جرنل بھی شائع ہو رہا ہے۔ "شاہکار" نام سے تخلیقی مجلّہ شائع ہو رہا ہے۔ مختلف اردو کتابیں شائع ہو رہی ہیں، اس کے باوجود ہجرت کی تکلیف، صدمہ تو دل میں رہ گئی ہے۔ اس کو ارمان شمسی کی زبان میں پڑھئے۔

"کیا آپ سمجھتے ہیں، کسی مہاجر کا دل دکھ سے خالی ہے؟ ایک زمانہ تھا جب یہ فعل ہجرت مقدس سے منسلک تھا لیکن اب یہ ہمارے لئے ایک لعنتی فعل بن گیا ہے۔ اس ہجرت کی وجہ سے میری زندگی تعفن زدہ ایک گھاؤ بن گئی ہے جس کی سڑاند کو میں ڈھکے ڈھکے پھرتا ہوں۔ کاش یہ گھاؤ اتنا بڑھ جائے کہ میرے وجود کو فنا کردے۔" [۲۵]

ہجرت کے وقت اپنی جائداد، پڑوسی اور اقارب کو چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔ اپنی یادگار کو ترک کر کے دوسری نا معلوم راستہ میں چل پڑنا ہوتا ہے۔ وہ حالت کیسی ہوتی ہے وہ بھی ارمان شمسی کی قلم سے یوں ظاہر ہوتی ہے۔

''ہمیں کس کے سہارے چھوڑ کر جارہے ہو،تمہارے جانے کے بعد یہ گلیاں محلے سب سنسان ہو جائیں گے،مکان حویلیاں کسٹوڈین میں چلی جائیں گی،ان پرشرنا رتھی قبضہ کرلیں گے۔''

تمہارے جانے کے بعد ہماری تہذیب وتمدن کی رونق دم توڑ دے گی۔ہمارے تہواروں کی شان چلی جائے گی،تمہاری اجداد کی ہڈیاں،جو یہاں دفن ہیں انپر کون فاتحہ پڑھا کرے گا''۔۲۶

مہاجرین کی زندگی اکثر بہت الجھن میں گزرتی ہے۔خصوصا قیام بنگلہ دیش کے بعد بنگلہ دیش میں مقیم مہاجرین کی حالات بہت سنگین ہوگئی تھی۔ ارمان شمسی ایک افسانہ میں ان حالات کو یوں بیان کرتے ہیں:

میں اپنے بنگالی دوست کے گھر گیا ہوا تھا،اس کے ابا گھر میں موجود نہیں تھے۔کچھ دیر میں وہ واپس آئے تو مجھے دیکھ کر چونکے''ارے باقر تم یہاں ہو؟'' یہ کہہ کرانہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولے'' خدا نے تمہاری جان رکھ لی۔تمہاری کالونی پرحملہ ہوا ہے،تمہارے ابا اماں چھوٹے بھائی بہن سب کوشہید کر دیا گیا۔ہنگامے کی آواز سن کر جب میں تمہارے مکان پر پہنچا تو سب دم توڑ چکے تھے۔ظالم لوگ کہہ رہے تھے باقر کی لاش یہاں نہیں ہے،وہ شاید نکل بھاگا ہے۔''۲۷

ارمان شمسی کے افسانے میں جنسیات ہے۔جنسیات کے لئے وہ مشہور بھی ہیں۔انہوں نے جنسیات کو کیوں موضوع بنایا اوراس سے کیا ملا ہے۔اس بات کا ذکر کرتے ہوئے'' چاندنگر'' افسانوی مجموعہ کے شروع میں وہ لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ منٹو مجھے پسند تھا لیکن عصمت،بیدی،کرشن چندر،قرۃ العین،پریم چند،علی عباس حسینی اور خواجہ عباس نے بھی متاثر کیا۔لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ جب میں نے اپنا پہلا افسانوی مجموعہ'' آشنائی کا کرب'' لکھا۔تو اسکے ڈانڈے کسی حد تک منٹو سے جا ملے۔مجھے دبی دبی اور کبھی سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔کلکتے میں میرے ایک شاعر دوست نے مجھ سے دریافت کیا۔کیا تم منٹو بننا چاہتے ہو؟ دیکھو باز آؤ اس خیال سے اور خود کو اس قابل بناؤ کہ تمہاری کتاب شرفا

کے گھروں میں بھی رکھی جا سکے'' اس تنقید کے زیر اثر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جس طرح میں سوچتا ہوں شاید اس طرح ہر کوئی نہیں سوچتا۔ پھر میں نے ''ڈھلان سے ابھرتا سورج'' ''خواب ریزے'' دو مجموعے اور لکھے جو جنسی معاملات سے مبرا تھے۔ یہ پچیس عدد کہانیوں لکھنے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ کہہ نہیں پایا۔ اس درمیان ''آشنائی کا کرب'' کو بہار اردو اکیڈمی پٹنہ کی جانب سے ایوارڈ ملنے کا اعلان سامنے آیا جو کہ میری پہلی کتاب تھی اور اسکی کہانیاں جنسی مسائل پر ہی مبنی تھیں۔

اب میری ہمت بڑھی اور میں نے نڈر ہو کر چوتھا مجموعہ پیاسی ندیا لکھا۔ جس کی تمام کہانیاں جنسی مسائل کو بنا کسی تلذذ کے اجاگر کرتی تھیں۔ اس کتاب کا بھی ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی'' کی جانب سے عندیہ ملا کہ تھوخریدداری کی فہرست میں کتاب چلی گئی ہے۔ میرے لئے دور دراز کا معاملہ تھا۔ پبلیشر کتابیں فراہم نہ کر سکا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

اب حالت یہ ہے ادبی حلقوں کے ہر مکتب فکر کو خوش رکھنے کے چکر میں گھن چکر بن گیا ہوں لیکن منٹو کے سائے سے پیچھا نہیں چھڑا سکا وہ ''شناخت'' ہو۔ ''ریشم کا جال'' ہو یا ''کالی پری'' ہو، یا ''پرچھائیاں'' ان سب مجموعات میں بھی کچھ کہانیوں کا رخ منٹو کی جانب مڑ ہی گیا ہے۔''[۲۸]

ارمان شمسی کیوں منٹو کا اقتدار کرتے ہیں اس کے بارے میں وہ خود اور لکھتے ہیں:

''منٹو کو فحش نگار یا جنس زدہ کہنا مناسب نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسکے افسانوں میں عورت کے کوائف بیشیر نظر آتے ہیں وہ انکے دکھ اور بیچارگی کا اظہار بے باکی سے کیا کرتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عورت کے جسمانی استحصال یا روحانی قتل کی منظر کشی قاری کی جنسی تسکین یا تلذز کے لئے کیا کرتا ہے۔ وہ بے خوفی سے ہمیں آئینہ دکھلاتا ہے اب یہ ہمارا قصور ہے کہ آئینے کے منظر میں ایسے کھو جائیں کہ پس منظر کے بارے میں غور ہی نہ کریں۔''[۲۹]

ارمان شمسی کو اگر چہ جنسیات پسند افسانہ نگار کہا جاتا ہے مگر انہوں نے جنس کو موضوع نہیں بنایا بلکہ وہ جنس زدہ معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ احمد الیاس اس موضوع پر لکھتے ہیں:

''میرے خیال میں ان کے افسانوں کا موضوع جنس نہیں بلکہ وہ جنس زدہ معاشرہ ہے جہاں

عورت اور مرد دونوں استحصال کا شکار ہور ہے ہیں۔ ارمان شمسی کا کہنا ہے کہ ان کے افسانوں میں جنس سے زندگی کا تعلق گوشت اور ناخن جیسا ہے۔ لہذا ان کی کہانیوں میں گوشت سے ناخن کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے اپنے کئی افسانوں میں انسان کی داخلی زندگی اور خارجی ماحول کے درمیان تناؤ اور کشمکش کی تصویر کشی کی ہے۔ انکے یہاں علامت نگاری بہت کم نظر آتی ہے، یہ ان کی کہانیوں کی ایک اور خوبی ہے۔ جو بات انہیں جیسی لگی، علامت کا سہارا لے بغیر وہی بات انہوں نے اسی طرح پیش کردی۔ البتہ اتنا ضرور خیال رکھا کہ انسانی تہذیب کی اعلی قدریں مجروح نہ ہوں۔"[۳۰]

احمد الیاس اور ایک مقالہ میں لکھتے ہیں:

"وہ اپنے ان کرداروں کے ذریعے ٹوٹتی اور گرتی ہوئی قدروں سے دوچار اپنے آس پاس کے انتشار زدہ سماجی اور معاشرتی نظام کی زبوں حالی کو اجاگر کرتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں طبقاتی معاشرہ اور سماجی اقدار کا محاسبہ کرتے ہیں اور اس احتساب کے عمل میں وہ قاری کو کہیں بھی جنسی تجسس سے گمراہ نہیں کرتے بلکہ اس کے شعور کو احساس برہنگی سے جھنجوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میرے خیال میں انہوں نے اپنی کہانیوں میں جنس نہیں بلکہ جنس زدہ معاشرے کو موضوع بنایا ہے جہاں عورت اور مرد دونوں کا استحصال ہو رہا ہے۔"[۳۱]

ارمان شمسی کی افسانہ نگاری کے بارے میں نوشاد نوری کہتے ہیں۔ ارمان کی نظر انسانی جبلت اور احساسات کی جزئیات پر بھرپور ہے۔"[۳۲]

افتخار امام صدیقی نے ارمان شمسی کو بنگلہ دیش کے لئے اردو کا تنہا مجاہد قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"ارمان شمسی کا ہر افسانہ اپنا سیاق وسباق اختیار کرتا ہے تو وہ اسے ربڑ کی طرح کھینچتے نہیں بلکہ جتنی اس میں سکت ہے وہیں تک اسے لے جا کر فنی کمال کو کاغذ بند کر دیتے ہیں، گویا قطرہ قطرہ تخلیقی نور کو پوری طرح نچوڑتے نہیں بلکہ اگلے کسی حساس موضوع میں سمو کر اسے بھی فن پارہ بنا دینے کی سعی کر کے سرخرو ہو جاتے ہیں۔"[۳۳]

ارمان شمسی کے بارے میں اظہار اثر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ وہ بنگلہ دیش میں مقیم ارمان شمسی کی افسانہ نگاری کی داد دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"آپ گلستاں کی سیر کر رہے ہوں تو آپ کو طرح طرح کے خوشنما پھول نظر آئیں گے جن میں سے ہر پھول آپ کا دل موہ لے گا۔ لیکن اگر آپ کسی بے آب و گیاہ صحرا سے گزر رہے ہیں جہاں میلوں تک سبزہ نظر نہیں آتا وہاں اچانک آپ کو چند پھول نظر آجائیں تو آپ کو پھولوں کی اصل قدر و قیمت کا احساس یقیناً ہوگا۔

بالکل احساس بنگلہ دیش کے ان افسانہ نگاروں کو پڑھ کر ہوتا ہے جو اردو میں افسانے لکھ رہے ہیں۔ چونکہ بنگلہ دیش میں اردو کو تقریباً ختم کر دیا گیا ہے اس لئے وہاں کے افسانہ نگار اپنی تخلیقات ہندوستان اور پاکستان کے رسائل میں شائع کرا کے اردو سے اپنی محبت کے جذبے کو تسکین دیتے رہتے ہیں۔ ارمان شمسی بھی بنگلہ دیش میں رہتے ہوئے اردو میں افسانے لکھتے ہیں اور ہندوستان کے رسائل میں شائع ہونے کے لئے بھیجتے رہتے ہیں۔ لیکن تخلیق کار کہیں کا بھی رہنے والا ہو اس کا اصل تعارف تو اس کی تخلیق ہوتی ہے اور اس کی تخلیقات قارئین کو دوہرا متاثر کرتی ہے۔"[۳۴]

ارمان شمسی کے بارے میں شمیم زمانوی لکھتے ہیں:

"انہوں نے زندگی کو بہت غور سے دیکھا، پرکھا اور برتا ہے۔ ایک عام آدمی اپنے اردگرد رونما ہونے والے واقعات سے اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا، ایک ادیب اور شاعر ہوتا ہے۔ ارمان شمسی ایک اچھے ادیب کی طرح معاشرے کے اردگرد نگاہ رکھتے ہیں۔ معاشرے کی برائیوں اور دکھوں کو محسوس کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ انسانی نفسیات پر بھی بہت گہری ہے۔"[۳۵]

سرور غزالی بھی ارمان شمسی کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

ارمان شمسی، ایسی تمام مایوس کن نہ سہی مگر ادب کی مشکل صورت حال میں ایک روشنی کا منبع ہیں۔ ان کی کہانیاں، افسانے صحیح معنوں میں شاہکار کہانیاں ہیں۔ زبان و اسلوب کا اعلیٰ معیار، کردار اور ماحول کی منظر کشی کا خوبصورت امتزاج، ان کا خاصہ

ہے۔اوراس کے ساتھ ساتھ وہ معاشرے کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو جس بے باکی کے ساتھ اٹھاتے ہیں اوراخلاق وتہذیب کی حدودکو پار کئے بغیر نہایت چابکدستی سے نباھتے ہیں وہ ان کا ہنر ہے۔کہانی ایسی گوندھی ہوئی کہ تسلسل ودلچسپی کا دامن تھامے قاری کو تخیل کے گھوڑے پر اڑائے لئے جارہی ہو۔"٣٦

ارمان شمسی کی افسانہ نگاری کی خوبی بیان کرتے ہوئے قمرانجم لکھتے ہیں:

"آج کل وہ انتہائی سنجیدہ مؤثر ادب لکھ رہیں۔انکی تحریر شگفتہ بھی ہے اور دلچسپ بھی۔زبان وبیان روزمرہ عام فہم ہے۔اسلوب بہت ہی پیارا ہے۔کردار نگاری میں انہیں کمال حاصل ہے انکی کہانیاں پڑھتے وقت کسی قسم کی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ آپ کہانی شروع کیجئے تو آپ کے بس کی بات نہیں رہتی کہ آپ انجام کے پہونچے بغیر کتاب ہاتھ سے رکھدیں اور جب انجام سامنے آتا ہے تو احساس کے تار جھنجھنا جاتے ہیں۔کبھی کبھی قاری سوچتا ہے کاش ایسا نہ ہوتا۔ پھرایک مدت تک کہانی کے اثرات ذہن پر مرتسم رہتے ہیں۔"٣٧

ارمان شمسی کے بارے میں احمدالیاس اور لکھتے ہیں:

"ارمان اپنے افسانوں کے ذریعہ بنگلہ دیش سے باہر کی ادبی دنیا میں اپنی پہچان بنا رہے ہیں۔میں انہیں نئی نسل کا افسانہ نگار سمجھتا ہوں اور مجھے یہ کہنے میں کچھ عار نہیں کہ وہ اپنے کرداروں،موضوعات،ماحول اور زبان وبیان کے حوالے سے بنگلہ دیش کے افسانہ نگاروں میں ایک الگ زاویۂ نگاہ اورایک علیحدہ مقام رکھتے ہیں۔"٣٨

ارمان شمسی نے اپنے نو افسانوی مجموعے سے بنگلہ دیش میں اردو افسانہ نگاری کا پرچم اونچا رکھا ہے۔بنگلہ دیش میں اردو کا ماحول نہ ہونے کی باوجود اردو افسانہ نگاری میں اپنا مقام پیدا کرلیا ہے۔

ارمان شمسی بنگلہ دیش کی اردو نثر نگاری کی شناخت ہے۔ ہم ان سے اور زیادہ تخلیقی کاوشوں کا خواہاں ہیں۔ وہ نئی نسل کے افسانہ نگار ہیں۔ نئی نسل بھی ان سے متاثر ہو کر بنگلہ دیش میں اردو افسانہ نگاری کو انشاء اللہ اور بھی آگے بڑھائے گی۔

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر لطیف احمد، ''شام ڈھلے''، راجشاہی یونیورسٹی، راجشاہی، ۲۰۱۹

۲۔ احمد سعدی، اور س.م ساجد، ''دود چراغ محفل''، شاہکار پبلیکشنز، ڈھاکہ، ۱۹۸۳ء، ص ۲

۳۔ س.م ساجد، ''ایک سوال انگن انگن''، بنگلہ اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن، ڈھاکہ، ۲۰۱۷ء، ص۵

۴۔ ارمان شمسی، میری اپنی کہانی، ''سہ ماہی رنگ'' (مدیر: شان بھارتی اور ڈاکٹر مشتاق صدف) ......، ص۸۔۹

۵۔ ارمان شمسی، گلچین کا خمار، ''آشنائی کا کرب''، بیسویں صدی میگزین، نئی دہلی، انڈیا، ۲۰۰۳، ص۱۴۹

۶۔ ارمان شمسی، میری اپنی کہانی، ''سہ ماہی رنگ''، ص۱۰

۷۔ افتخار امام صدیقی، ارمان شمسی تنہا مجاہد... اردو مخالف دیش کا، ''شاعر''، اگست ۲۰۱۰ء، ص۵۶

۸۔ ارمان شمسی، حرف آغاز، ''پیاسی ندیا''، رنگ پبلی کیشنز، انڈیا، ۲۰۰۹ء، ص۷

۹۔ ارمان شمسی کی نجی فائیل سے ماخوذ ہے۔

۱۰۔ ارمان شمسی، منٹو کا سایہ، ''چاندنگر''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۷ء، ص۱۴

۱۱۔ ارمان شمسی، سخن ہائے گفتی، ''پرچھائیاں''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۷ء، ص۴

۱۲۔ مرزا رفیق شاکر، صحرائے اعظم میں نخلستان، ''کالی پری''، بزم افضل، کولکاتا، ۲۰۱۳ء، ص۸

۱۳۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، ارمان شمسی کے افسانے میں معاشرے کی تلخی، ''چاندنگر'' ص، ۲۶

۱۴۔ شمیم زمانوی، ارمان شمسی: شخصیت کے آئینے میں، ''سہ ماہی رنگ'' ص۲۱

۱۵۔ ارمان شمسی، بھوک کا شکنجہ، ''ڈھلان سے ابھرتا سورج'' بیسویں صدی بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۶، ص۸۹۔۹۰

۱۶۔ سلطانہ مہر، ''گفتنی''، حصہ اول، مہر بک فاؤنڈیشن، کراچی ۲۰۰۰ء، ص۳۶

۱۷۔ ارمان شمسی، منجدھار، ''آشنائی کا کرب'' بیسویں صدی میگزین، نئی دہلی، ۲۰۰۳، ص ۹
۱۸۔ شمیم زمانوی، ارمان شمسی: شخصیت کے آئینے میں، سہ ماہی رنگ، ص ۲۲
۱۹۔ ارمان شمسی، ڈھلان سے ابھرتا سورج، ص ۱۰
۲۰۔ ارمان شمسی، خواب ریزے، ''خواب ریزے'' رنگ پبلی کیشنز، دھنباد، بھارت، ۲۰۰۹ء ص ۱۵۴
۲۱۔ ارمان شمسی، بوجھ، ''کالی پری'' ص، ۸۶
۲۲۔ ارمان شمسی، ممتا کی چاہ، ''خواب ریزے''، ص ۹
۲۳۔ ارمان شمسی، خواب ریزے۔ ''خواب ریزے'' ص ۱۵۹
۲۴۔ ارمان شمسی، فیثا سی گنگڈم، ''ڈھلان سے ابھرتا سورج''، بیسویں صدی بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۶، ص ۲۵
۲۵۔ ارمان شمسی، سن آف بنگلہ دیش، ''چاندنگر'' ص۔ ۵۹
۲۶۔ ارمان شمسی، چاندنگر، ''چاندنگر''، ص ۲۳
۲۷۔ ارمان شمسی، سن آف بنگلہ دیش، ''چاندنگر'' ص۔ ۵۷
۲۸۔ ارمان شمسی، منٹو کا سایہ، ''چاندنگر''، ص ۱۴۔ ۱۵
۲۹۔ ایضاً، ص۔ ۱۲
۳۰۔ احمد الیاس، ارمان شمسی ایک منفرد افسانہ نگار، ''سہ ماہی رنگ''، ص ۲۳۔ ۲۴
۳۱۔ احمد الیاس، ارمان شمسی۔ نئی نسل کا افسانہ نگار، نجی مسودہ، ص ۲
۳۲۔ شمیم زمانوی، ارمان شمسی: شخصیت کے آئینے میں، ''سہ ماہی رنگ''، ص ۲۱
۳۳۔ افتخار امام صدیقی، ارمان شمسی تنہا مجاہد۔ اردو مخالف دیش کا، ''شاعر''، اگست ۲۰۱۰، ص ۵۶
۳۴۔ افتخار امام صدیقی، ارمان شمسی۔۔ اپنوں کی تنقیدی سان پر۔ ''شاعر''، اگست ۲۰۱۰، ص ۵۷
۳۵۔ شمیم زمانوی، ارمان شمسی: شخصیت کے آئینے میں، ''سہ ماہی رنگ'' ص ۲۱
۳۶۔ سرور غزالی، ارمان شمسی، بنگلہ دیش میں آفتاب اردو، ''ریشم کا جال''، بزم افضل، کولکاتا، ۲۰۱۴، ص ۱۲
۳۷۔ محمد قمر انجم، ارمان شمسی عصر حاضر کا ادیب، ''سہ ماہی رنگ''، ص ۱۷
۳۸۔ احمد الیاس، ارمان شمسی ایک منفرد افسانہ نگار، ''سہ ماہی رنگ''، ص ۳۶